ویکوم محمد بشیر

1910 تا 1994

ویکوم محمد بشیر کی ولادت کیرالا میں ہوئی۔ ان کے والد عمارتی لکڑی کے ٹھیکے دار تھے۔ کاروبار میں بڑے نقصان سے دوچار ہونے کی وجہ سے ان کا گھرانا غریبی اور تنگ دستی کا شکار ہوگیا۔

محمد بشیر بچپن ہی سے بڑے ذہین اور ملنسار انسان تھے۔ نہایت حسّاس طبیعت رکھتے تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ اس کی وجہ سے انھیں اسکول چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ ان کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئیں کہ ان کی وجہ سے انھیں کیرالا بھی چھوڑنا پڑا۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں ملک کے مختلف حصّوں میں گھومتے پھرے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملتے جلتے رہے۔ یہ دور تجربات کے لحاظ سے ان کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں رفتہ رفتہ یقین ہوتا گیا کہ زندگی اپنی رنگارنگی کے باوجود دنیا میں ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی پیدائش اور موت کے درمیانی وقفے کو کسی نہ کسی طور گزار دینے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔

محمد بشیر نے 1937 کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر 27 سال تھی۔ وہ زندگی کا جو وسیع اور رنگا رنگ تجربہ حاصل کر چکے تھے، اس سے بہت کم لوگ گزرتے ہیں۔ دراصل یہی تجربات بشیر کی زندگی کے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ویکوم محمد بشیر کی پہلی اہم تخلیق ''بچپن کی ساتھی'' (مطبوعہ 1944) ہے جسے انھوں نے اپنی کتابِ زندگی کا ایک ورق قرار دیا۔ اس کہانی نے ملیالم کے افسانوی ادب کو نئی راہ دکھائی۔ محمد بشیر کی کہانیاں زندگی کی حقیقتوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کی بنیاد ان کے حقیقی تجربے تھے۔ وہ اپنی بات نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم انداز میں لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ملیالم ناول اور افسانے کی زبان پر ان کی تخلیقات کے گہرے اثرات ہیں۔ اس کا اعتراف کئی نقادوں نے کیا ہے۔

ویکوم محمد بشیر کو ان کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ 1970 میں ساہتیہ اکادمی کی

© NCERT not to be republished

فیلوشپ ملی۔1982 میں حکومت ہند نے ''پدم شری'' کا خطاب دیا اور 1987 میں کالی کٹ یونیورسٹی نے اپنے اس عظیم فنکار کو جو رسمی تعلیم حاصل نہ کرسکا تھا، ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی سند عطا کی۔

محمد بشیر نے انتقال سے پہلے اپنا آخری مضمون ان الفاظ پر ختم کیا تھا: ''میں اپنے سفر کے خاتمے پر پہنچ رہا ہوں۔کون جانے شاید یہ کسی دوسرے سفر کا آغاز ہو۔ وقت صرف خدا کے خزانے میں ہے، وہی میری راہ متعین کرے گا۔ میں دنیا کی خوش حالی کی تمنّا کرتا ہوں اور ہر فرد و بشر کی مسرت اور اس کے سکون واطمینان کی دعا کرتا ہوں۔''

© NCERT not to be republished

جنم دن

مکرام کی آٹھویں تاریخ ہے، آج میرا جنم دن ہے۔ میں اپنے معمول کے خلاف صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ نہا دھوکر کھدّر کی قمیض، دھوتی اور سفید کینوس کے جوتے پہنے اور آرام کرسی پر تکیہ لگا کر بجھے ہوئے دل سے دراز ہوگیا۔ میرا پڑوسی میتھیو جو بی۔اے۔ کا طالب علم تھا، مجھے اتنے سویرے بیدار دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔

''ہیلو! گڈ مارننگ'' اس نے انگریزی میں کہا۔

''جی!'' میں نے جواب دیا۔ ''گڈ مارننگ۔''

© NCERT not to be republished

اس نے پوچھا— ''آج آپ اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے......کیا کہیں جانا ہے؟''

''نہیں'' میں نے بتایا : ''آج میرا جنم دن ہے۔''

''آپ کا برتھ ڈے'' اس نے انگریزی میں پوچھا؟

''جی ہاں''

''خوشی کا یہ دن تمھاری زندگی میں بار بار آئے۔''

''شکریہ''

میتھیو اپنے دانتوں میں برش دبائے ہوئے غسل خانے میں داخل ہوا۔ چاروں طرف سے شوروغل کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان ملی جلی آوازوں میں پیار کے نغمے بھی شامل تھے۔ وہ لوگ طالب علم اور کلرک تھے۔ ''کیا ان میں سے کسی کو کوئی پریشانی تھی؟'' ان کے لیے زندگی تو بہت خوشگوار تھی، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک کپ چائے کس طرح مل سکے گی۔ دوپہر کا کھانا یقینی تھا۔ کل جب میں بازار جارہا تھا تو حامد نے مجھے بغیر کسی وجہ کے دوپہر کے کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ ایک معمولی سا شاعر لیکن امیر آدمی ہے، لیکن میں لنچ کے وقت تک بغیر چائے کے نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ میتھیو کا بوڑھا نوکر اس کے لیے چائے بنانے میں مصروف ہے۔ میرا کمرہ میتھیو کے باورچی خانے کا اسٹور بنا ہوا تھا۔ مالک مکان نے آٹھ آنے ماہوار پر مجھے کرایے پر دیا تھا۔ یہ پوری عمارت میں سب سے چھوٹا کمرہ ہے۔ میری آرام کرسی، میز، الماری اور پلنگ کے بعد مشکل سے سانس لینے کو جگہ بچتی ہے۔ احاطے کی دیوار سے گھری تین عمارتوں کے تمام کمروں میں طالب علم اور کلرک رہتے ہیں۔ میں واحد آدمی ہوں جسے مالک مکان پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پابندی سے کرایہ ادا نہیں کرتا۔

آج میرا جنم دن ہے۔ میں اپنے گھر سے دور ہوں۔ میرے پاس پیسے بھی نہیں اور قرض لینے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں، وہ خود میرے دوستوں کے ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے اپنا کہہ سکوں۔ میتھیو نے جب مجھے جنم دن پر بہت سی نیک خواہشات پیش کیں تو میرا دل غم زدہ ہوگیا۔

سات بجے: مجھے یاد آرہا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے میں نے سوچا: کم سے کم اس روز مجھے کسی غلط کام سے بچنا چاہیے۔ آج کے دن مجھے کسی سے قرض نہیں لینا چاہیے اور آج کوئی غلط بات نہیں ہونی چاہیے۔ آج کے ''میں'' کو میرے ان سینکڑوں رنگ بدلتے چہروں سے بالکل مختلف ہونا چاہیے جو ماضی کے سفید وسیاہ شب وروز میں نظر آرہے ہیں۔ آج میری عمر کتنی ہوگئی؟ پچھلے سال کے مقابلے میں ایک برس اور بڑا ہوگیا ہوں......پچھلے سال......چھبیس (26) نہیں بتیس (32) یا سینتالیس (47)؟

© NCERT not to be republished

میرا ذہن بے حد پریشان تھا۔ میں نے اُٹھ کر آئینے میں دیکھا: میں اتنا بڑا تو نہیں ہوں۔ ایک خاصا منفرد چہرہ، اونچی اور کشادہ پیشانی، ٹھہری ٹھہری آنکھیں، ایک خمیدہ تلوار کی طرح باریک مونچھیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی برا نہیں تھا۔ اس سوچ کے دوران مجھے ایک ایسی چیز نظر آئی جس سے مجھے دھکّا لگا۔ میرے کان کے اوپر کالے بالوں کے درمیان سفید لکیر سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کوشش کرکے اسے کھینچ کر نکال دیا۔ پھر میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پشت پر سے میرا سر خاصا ہموار تھا۔ سر پر ہاتھ پھیرنے کے دوران مجھے سر میں ہلکا سا درد محسوس ہوا۔ ممکن ہے کہ چائے نہ پینے کی وجہ سے ہو۔

نو بجے: ہوٹل کے مالک نے دور سے دیکھ لیا اور وہ چہرہ بسورتا ہوا اندر واپس چلا گیا۔ ہوٹل کا مَیلا کچیلا چھوکرا جس نے چائے بنائی تھی، نقد پیسے مانگنے لگا۔

میں نے کہا : ’’ارے بھائی، پیسے کل دے دوں گا۔‘‘

اسے مجھ پر اعتبار نہیں تھا : ’’آپ نے کل بھی یہی کہا تھا۔‘‘

اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

’’مجھے خیال تھا کہ مجھے آج کچھ پیسے مل جائیں گے۔‘‘

’’مجھے حکم ہے کہ جب تک پہلے کے پیسے نہ دے دیں آپ کو چائے نہیں دی جائے۔‘‘

’’اوہ‘‘

دس بجے: میرے ہونٹ سوکھ گئے۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ دوپہر کی سخت گرمی کی وجہ سے میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اسی لمحہ آٹھ دس سال کی عمر کے پتلے دبلے زرد چہرے والے دو عیسائی لڑکے لکڑی کی کھڑاؤں بیچتے ہوئے میرے دروازے پر آئے۔ انھوں نے آواز لگائی: تین آنے جوڑا۔

’’لڑکو! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

’’لیکن، اگر آپ جیسے لوگ بھی نہیں خریدیں گے تو پھر کون خریدے گا؟‘‘

لڑکو! مجھے ضرورت نہیں ہے...... میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔‘‘

’’اوہ‘‘

ان کے چہروں پر بے اعتباری تھی۔ وہ اتنے معصوم تھے کہ ظاہر کے پیچھے حقیقت کو نہیں سمجھ پائے۔ میرے کپڑوں، میری آرام کرسی کو دیکھ کر مجھے سر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے لیکن آرام کرسی، قمیض، دھوتی، جوتے ...... ان میں سے کچھ بھی میرا نہیں ہے۔

میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرا بدن بھی کیا میرا اپنا ہے؟ ہندوستان کا ہر شہر میں نے گھوما ہے اور کتنی الگ الگ جگہوں پر الگ الگ طرح سے رہتا رہا ہوں۔ میرا خون، میرا گوشت پوست اور میری ہڈّیاں تک ہندوستانی ہیں۔ کنیا کماری سے کشمیر تک، کراچی سے کلکتہ تک۔ دراصل ہندوستان کے تقریباً ہر حصّے میں میرے دوست موجود ہیں۔ مرد، عورت، میرے سبھی دوست ایک ایک کرکے میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ پورے چاند کی چاندنی کی طرح معطّر میری محبت پورے ہندوستان میں پھیل جائے۔ میری یہ خواہش ہے، لیکن مجھے جاننے والا مجھ سے محبت کرنے والا کون ہے؟ میں سب کچھ ہوں لیکن واقعتاً میں کیا ہوں؟ 'آہ' مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے! درد سے میرا سر پھٹا جارہا ہے۔ کیونکہ میں نے چائے نہیں پی تھی؟ درد کی وجہ سے سر اٹھانے میں بھی تکلیف ہورہی تھی۔ بہتر ہے کہ میں جاکر کھانا کھاؤں۔ اسی سر درد کی حالت میں مجھے ایک میل کی مسافت طے کرنا ہے لیکن کم سے کم بھر پیٹ کھانا تو مل جائے گا۔

گیارہ بجے: حامد دکان پر نہیں تھا۔ کیا وہ گھر چلا گیا؟

زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلتا۔ ممکن ہے وہ بھول گیا ہو۔ میں اس کے گھر جاؤں تو؟

ساڑھے گیارہ بجے: حامد کے دومنزلہ گھر کے آہنی دروازے بند ہو چکے تھے۔ میں نے کھٹکھٹایا: ''مسٹر حامد''

ایک عورت نے جواب دیا: ''وہ نہیں ہیں۔'' وہ کہاں گئے ہیں؟ کوئی جواب نہیں۔ تنگ آکر واپس جانے سے پہلے میں نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔

میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سُنی۔ تھوڑا سا دروازہ کُھلا۔ ایک جوان خاتون دکھائی دی۔

''میں نے اس سے پوچھا کہ حامد کہاں گئے ہیں۔''

''انھیں فوری طور پر کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔''

''وہ کب واپس آئیں گے؟''

''شام کو دیر سے آئیں گے۔''

''شام کو دیر سے؟''

''جب وہ واپس آجائیں تو مہربانی کرکے انھیں میرے آنے کے بارے میں بتا دینا۔''

''میں کیا نام بتاؤں؟''

''میں کون ہوں؟''

''میں ...... اوہ ...... کچھ نہیں ، میں کیا بتاؤں؟ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ریت گرم خشک چینی کی طرح ہورہی تھی۔ جھیل کا پانی شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں بہت پریشان تھا۔ میری ہڈّیاں جل رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس۔ میں فاقے سے تھا۔ مجھے اتنی بھوک لگ رہی تھی کہ اگر مٹّی ملتی تو اس کو بھی کھالیتا۔ میری بھوک کی شدت اس احساس کی وجہ سے اور بڑھ گئی کہ میرے پاس کھانا حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ شب وروز کا ایک لامتناہی سلسلہ میرے سامنے تھا لیکن کھانا ملنے کی کوئی توقّع نہیں تھی۔ میں نقاہت سے گرا جارہا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے: میرے شناسا میرے پاس سے اس طرح سے گزر گئے کہ جیسے انھوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

''اے میرے دوستو! میرے جنم دن پر میرے لیے خوشی کی دعائیں کرو۔''

میں اپنے آپ سے سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا۔ ان کے سائے میرے قریب سے گزرتے گئے۔ ایسا کیوں ہوا کہ میرے دوستوں نے مجھے دیکھ کر مجھ سے بات تک نہیں کی؟

کیا یہ اس وجہ سے تو نہیں تھا کہ ایک سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا آدمی میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

ایک بجے: میں مسٹر ''پی'' کے پاس پہنچا جو پہلے ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے اور اب ایک دکان کے مالک۔ مجھے بھوک کی شدّت میں مشکل سے نظر آرہا تھا۔ ''پی'' نے پوچھا کہ ''انقلاب'' آنے میں کتنی دیر ہے۔

''بہت جلد آنے والا ہے۔''

''اہا۔ ہا۔ کیا کوئی خاص بات؟

''ارے کوئی بات نہیں، بس یوں ہی آگیا۔''

میں اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بہت سے مضامین اس کے نام سے شائع ہوچکے تھے۔ اپنی شان دکھانے کی غرض سے اُس نے بہت سے پُرانے پرچوں کو یکجا کرکے جلد بندھوائی تھی۔ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اس کو دیکھنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس سے آواز آرہی تھی ''میں ایک کپ چائے پینا چاہتا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں۔'' ''پی'' مجھ سے چائے کے لیے کیوں نہیں پوچھ رہا ہے؟ کیا اُسے میری تکان نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سنجیدگی سے گلّے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں گونگا بنا ہوا گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ دو بھکاری لڑکے کوڑے کے ڈھیر میں پڑے ہوئے ایک ڈوسے کے ٹکڑے پر جھگڑ رہے تھے۔ میرے پورے وجود نے ایک خاموش التجا کی۔

''ایک کپ چائے'' — ''پی'' نے اپنا بکس کھولا اور اس میں سے ایک آنہ نکال کر ایک لڑکے کو دے دیا۔

’’چائے لاؤ‘‘ اس نے کہا۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ لڑکا چائے لینے کے لیے چلا گیا ’’پی‘‘ نے لڑکے کے لائے ہوئے چائے کا کپ لے کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’کیا تم چائے پیو گے؟‘‘

میں نے کہا ’’نہیں‘‘ اور میں اپنے جوتے کے فیتے باندھنے کے بہانے جھک گیا۔ ’’پی‘‘ نے شکایت کی— ’’تم نے مجھے اپنی کوئی کتاب نہیں دی۔‘‘

’’میں ضرور دوں گا۔‘‘

’’میں ان پر تبصرے پڑھتا رہا ہوں۔‘‘

’’خوب!‘‘ میں نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن جب دل بجھا ہوا ہو تو چہرے پر مسکراہٹ کیسے آ سکتی ہے؟

میں اُٹھا اور سڑک پر چل دیا۔

سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا آدمی میرا تعاقب کر رہا تھا۔

دو بجے: میں تھکا ماندہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی عورت جو عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھی، میرے دروازے پر آئی۔ وہ کسی دور دراز علاقے سے آئی تھی۔ اس کا شہر سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔

’’بہن، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کہیں اور جاؤ۔‘‘

’’اوہ‘‘ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ کورا جواب پا کر اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ کیا مہک چھوڑ گئی۔

تین بجے: اگر میں کسی سے قرض لیتا ہوں تو اس میں کیا بات ہے؟ میری نقاہت انتہا کو پہنچ چکی تھی، عجب بے بسی کا عالم تھا۔ میں کس کے پاس جاؤں؟ میرے ذہن میں بہت سے نام آ رہے تھے لیکن کسی سے قرض لینا اپنی خودداری کو مجروح کرنا ہے.......... کیا میں خودکشی کر لوں؟ موت کیسی ہوگی؟

ساڑھے تین بجے: میری زبان لڑکھڑا گئی۔ کاش میں اپنے آپ کسی سمندر کے ٹھنڈے پانی میں ڈوب سکتا! اسی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ مجھے کچھ ایڈیٹروں کے خط ملے۔ ان کا مطالبہ واپسی ڈاک میں کہانیاں مانگنے کا تھا۔ خطوں کو ایک طرف پھینک کر میں بے بسی سے پڑا رہا۔ بینک کلرک کرشنا پلّے کا ملازم لڑکا ماچس مانگنے آیا۔ میں نے اس سے پانی کا ایک گلاس منگوا کر پیا۔

’’مالک، کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟‘‘ لڑکا جاننا چاہتا تھا۔

’’میں بالکل ٹھیک ہوں۔‘‘

© NCERT not to be republished

تو پھر...... ''کیا آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے؟''

''نہیں''

''کیوں نہیں کھایا؟''

بچّے کا معصوم چہرہ، کالی آنکھیں، کالے دھبّے لگا ہوا کپڑا، جسے وہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے آہستہ سے پکارا'' مالک۔''

''ہوں'' میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

''میرے پاس دو آنے ہیں۔''

''تو''

اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''اگلے مہینے میرے گھر جانے سے پہلے آپ یہ پیسہ واپس دے دیں۔''

میں اس کی بات سے بہت متاثر ہوا۔

''لے آؤ'' میں نے کہا۔

میری بات پوری طرح سُنے بغیر ہی وہ چلا گیا۔

اسی وقت میرا دوست گنگا دھر آ گیا۔ وہ سفید کھادی کی دھوتی اور سفید کھدّر کا جبّہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر نیلے رنگ کی شال پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ مجھے آرام کرسی پر بے تعلّق سا پڑا دیکھ کر اس نیتا نے مجھ سے کہا: ''تم تو بڑے بورژوا ہوگئے ہو۔'' اگرچہ میرا سر چکرا رہا تھا پھر بھی میں ہنس پڑا۔ مجھے تعجّب ہو رہا تھا کہ یہ نیتا جو کپڑے پہنے ہوئے ہے، کس کے ہیں! میری باطنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہر جاننے والے قومی کارکن کی تصویر گزر رہی تھی۔

''تم کیوں ہنس رہے ہو؟'' گنگا دھر نے پوچھا۔

''ارے، کچھ نہیں، بیٹے، مجھے تمہارے حلیے کو دیکھ کر ہنسی آ گئی۔''

''مذاق بند کرو اور میری بات سنو۔ ایک بڑی پریشانی آ پڑی ہے۔ قریب تین ہزار مزدوروں نے ہڑتال کردی۔ وہ ڈیڑھ ہفتے سے بھوکے مر رہے ہیں۔ یہ مصیبت بڑھ سکتی ہے۔''

''کیا بات ہے؟ اخباروں میں تو یہ خبر پڑھی نہیں۔'' ''اخباروں میں اس خبر کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔''

''یہ اچھی بات ہے۔''

''اس کے بارے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو۔'' اس سلسلے میں ایک جلسہ ہو رہا ہے، میں اس کا صدر ہوں۔ وہاں کشتی سے پہنچنے کے لیے ایک آنے کی ضرورت ہے۔ آج میں نے کچھ نہیں کھایا......

''تم میرے ساتھ چلو۔''

''بیٹے یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ کئی روز سے میرے منھ میں کھیل تک نہیں گئی ہے۔ آج میرا جنم دن ہے۔ میں نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ پھر بھی دیکھتے ہیں، تھوڑا انتظار کرو۔'' پھر گنگا دھر، مزدوروں، قومی کارکنوں اور گورنمنٹ کے بارے میں بولنے لگا۔ میں اخبار کے ایڈیٹروں اور ادیبوں کے بارے میں ذکر کرتا رہا۔ اس دوران ملازم لڑکا واپس آیا۔ میں نے اس سے ایک آنہ لیا اور چائے، بیڑی اور ڈوسا وغیرہ لانے کو کہا۔ وہ چائے اور چند بیڑیاں، ایک ڈوسا جو چھوٹا سا پاپڑ لگ رہا تھا، لے آیا۔ کسی امریکی اخبار کے کاغذ کا ٹکڑا جس میں ڈوسا لپٹا ہوا تھا۔ اس پر ایک تصویر چھپی ہوئی تھی، جو میری توجّہ کا مرکز بن گئی۔ میں اور گنگا دھر ڈوسا کھانے لگے۔ ایک گلاس پانی پی کر چائے پی اور بیڑی جلائی اور ایک آنا گنگا دھر کو دے دیا۔ چلتے وقت اس نے مذاقاً مجھ سے کہا۔ ''آج آپ کا جنم دن ہے نا۔ کیا آپ دنیا کے نام کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا،''ہاں بیٹا'' انقلاب سے متعلق ایک پیغام!

''مجھے بتاؤ''

''ہر جگہ انقلاب کے شعلے بھڑکا دو۔ موجودہ سماجی نظام کو جلا کر راکھ کردو اور ایک نئی دنیا پیدا کرو۔''

''بہت اچھا، یہ پیغام مزدوروں تک پہنچا دوں گا۔''

گنگا دھر تیزی سے چلا گیا۔ میں متعدد قومی کارکنوں اور ادیبوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ سب لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیٹ کر سوچتے سوچتے میں نے اخبار کا وہ ٹکڑا اٹھایا جس میں ڈوسا لپٹا ہوا تھا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ مالک مکان غصے کے عالم میں دروازے سے میری طرف آیا۔ میں شش و پنج میں تھا کہ اس سے کیا بہانہ کروں گا۔ اس لیے میں تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں ایک ایسا شہر تھا جو فلک بوس عمارتوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان عمارتوں کے درمیان ایک آدمی سر اُٹھائے آہنی زنجیروں سے بندھا ہوا زمین پر کھڑا تھا لیکن وہ نہ تو زنجیروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور نہ ہی زمین کی طرف۔ وہ بہت دور ستاروں سے پرے لامحدود خلا میں شعائیں بکھیرتے ہوئے روشنی کے ایک بڑے منبع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک کُھلی کتاب رکھی تھی۔ اس کے کھلے دو صفحات پر درحقیقت بنی نوع انسان کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ وہ تحریر اس طرح تھی۔'' حالانکہ وہ زمین پر زنجیروں سے بندھا تھا لیکن

اس کی نظریں زمان ومکاں سے ماورا مستقبل میں ہونے والی شاندار ترقّی پر تھیں۔

کہیے جناب، مالک مکان نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔

''کیا آج آپ کرایہ ادا کر سکتے ہیں؟''

میں نے کہا، ''مجھے اب تک میرا پیسہ نہیں ملا ہے۔ چند روز میں ضرور ادا کر دوں گا۔'' ''ایسی زندگی کس کام کی؟'' اس نے پوچھا۔

یہ بات صحیح تھی۔ ایسی زندگی کس کام کی؟

تین سال پہلے میں اس عمارت میں آیا تھا۔ میں نے باورچی خانوں کی مرمّت کرائی تھی۔ ان میں سے ہر ایک خاصے اچھے کرائے پر اُٹھا ہوا ہے۔ اب میں نے چوتھا اسٹور روم بنا دیا ہے۔ تب وہ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ یہ زیادہ کرائے پر اُٹھ سکتا ہے۔ اگر میں اس کا زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا تو میں اس کو خالی کر دوں۔

نہیں۔ میں اس کمرے کو خالی نہیں کروں گا!

چار بجے: میں اس ملک سے اُکتا گیا ہوں۔ اس شہر میں دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے، مجھے یہاں وہی دکانیں، وہی سڑکیں اور وہی چہرے نظر آتے ہیں اور وہی باتیں سننے میں آتی ہیں....... میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔

چھ بجے: شام سہانی تھی۔ ڈوبتا سورج خون کے ایک ایسے گولے کی طرح لگ رہا تھا جسے سمندر نے نگل لیا ہو۔ آسمان کے مغرب میں سنہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سمندر بیکراں نظر آرہا تھا۔ نزدیک ہی لہریں مارتی ہوئی جھیل تھی۔ اس کا ساحل کتنا پُرسکون تھا۔ من چلے نوجوان سگریٹ پیتے ہوئے چہل قدمی کررہے تھے۔ نوجوان عورتیں شاندار ساڑیاں پہنے ہوئے دُزدیدہ نگاہوں اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں آرام کررہی تھیں۔ دل لُبھانے کے لیے عشقیہ فلموں کے گیت بھی سُنے جا سکتے تھے۔ فضا میں پھولوں کی بھینی مہک گُھلی ہوئی تھی ...... لیکن میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔

سات بجے: ایک سپاہی گھر پر آیا اور مجھے دوبارہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے چکا چوند کردینے والے پیٹرومیکس لیمپ کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ جب میں پولس والوں کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا تو ڈپٹی کمشنر ٹہلتے ہوئے میرے چہرے کے تاثرات کا بڑی توجہ کے ساتھ مشاہدہ کررہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی میرے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی۔ ان نظروں میں کتنی حقارت تھی جیسے میں نے کوئی خوفناک جرم کیا ہو۔ مجھ سے ایک گھنٹے تک پوچھ تاچھ ہوتی رہی۔ کون کون میرے دوست ہیں؟ میرے پاس خط کہاں سے آتے ہیں۔ کیا میں کسی خفیہ تنظیم کا ممبر تو نہیں ہوں، جو حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہے؟

''میں آج کل کون سی نئی چیز لکھ رہا ہوں؟'' مجھے صحیح صحیح پوری بات بتانا چاہیے۔

''تم جانتے ہو کہ میں تمھیں شہر بدر کر سکتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں کہ میں بالکل بے بس ہوں۔ اگر صرف ایک سپاہی چاہے تو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال سکتا ہے۔''

ساڑھے سات بجے: میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور اندھیرے میں بیٹھا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ آج میرے کمرے میں روشنی بھی نہیں تھی۔ تھوڑا سا بھی مٹّی کا تیل کہاں سے لاتا اور بھوک کو مٹانے کے لیے کچھ کھانا بھی ضروری تھا۔ مجھے کھانا کون دے گا؟ کسی سے قرض بھی نہیں لے سکتا۔ اگر میتھیو سے کہا جائے تو؟ نہیں، میں چشمہ لگانے والے اس طالب علم سے قرض کے طور پر ایک روپیہ لوں گا۔ وہ اگلی عمارت میں رہتا ہے۔ اس نے اپنی حالیہ بیماری کے دوران انجکشنوں پر خاصی رقم خرچ کی تھی۔ آخرکار، وہ میری چار آنے والی دوا سے ٹھیک ہوا۔ اس کے بدلے میں وہ مجھے ایک مرتبہ سنیما دکھانے لے گیا تھا۔ اگر میں اس کے پاس جا کر ایک روپیہ مانگوں تو وہ انکار نہیں کر دے گا۔

آٹھ بج کر پینتالیس منٹ: راستے میں میں نے میتھیو کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ سنیما دیکھنے گیا ہوا تھا۔ زور سے بولنے اور قہقہوں کی آواز سن کر میں دوسری عمارت کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں سے سگریٹ کے دھویں کی بو اور گیس کی لالٹین کی روشنی آ رہی تھی۔ میں بے بسی کا مجسّمہ بنا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے اپنی بات چیت جاری رکھی۔ قومی معاملات، سنیما، کالج کی لڑکیوں کی باتیں۔ ان لڑکیوں کا ذکر جو دن میں دو بار ساڑیاں بدلتی ہیں اور اس طرح کی بہت سی باتیں۔ میں بھی ان کی باتوں میں شامل ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔

نو بجے: میں نے اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بستر پر پڑا رہا۔ مجھے دنیا کے بے بس غریب لوگوں کا خیال آیا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں کروڑوں لوگ بھوکے پڑے ہوں گے۔ میں بھی ان کروڑوں لوگوں میں سے ایک تھا۔ مجھ میں کیا خاص بات ہے؟ میں بھی ایک غریب آدمی ہوں اور بس، جبکہ میں اس طرح سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا............میرے منھ میں پانی بھر آیا۔

میتھیو کے باورچی خانے سے سرسوں کے پروسنے کی آواز آ رہی تھی............اور اُبلے ہوئے چاولوں کی خوشبو بھی۔

ساڑھے نو بجے: میں کمرے سے باہر آیا۔ میرا دل اتنی تیزی سے اُچھل رہا تھا جیسے کہ وہ پھٹ جائے گا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو! میں پسینے میں شرابور تھا۔ صحن میں کچھ دیر رُکا۔ قسمت سے بوڑھا نوکر ایک برتن اور لیمپ لیے ہوئے نکلا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا چھوڑ دیا اور نل کی طرف چلا گیا۔ کم از کم اُسے دس منٹ ضرور لگیں گے۔ میں نے دروازہ کھولا اور باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔

دس بجے: میں پسینے سے شرابور باورچی خانے سے نکلا لیکن میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ جب بوڑھا آدمی واپس آرہا تھا، میں نل کی طرف چلا گیا۔ تھوڑا پانی پیا اور ہاتھ، منھ، پاؤں دھوئے۔ کمرے میں پہنچ کر بیڑی سلگائی اور کش لینے لگا۔ میں بالکل تھک چکا تھا۔ اس لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے مجھے یہ خیال آرہا تھا، کہیں بوڑھے کو پتا تو نہیں چل گیا۔ اگر ایسا ہے تو میتھیو کو ضرور پتا چل جائے گا اور دوسرے طالب علموں اور کلرکوں کو بھی معلوم ہوجائے گا۔ کم سے کم اپنے جنم دن پر آرام سے سو تو سکوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ تب ہی ایک شخص میرے کمرے پر آیا۔

''ہیلو مسٹر......! میتھیو کی آواز آئی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ میری نیند اڑ گئی۔ سارا کھایا پیا برابر ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ میتھیو کو پتا چل گیا ہے۔ بوڑھے کو پتا چل گیا ہوگا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا کہ اندھیرے میں یکایک میں فلیش لائٹ کی زد میں آکر پکڑا گیا تھا۔

میتھیو کیا پوچھنے والا تھا؟

مجھے ایسا لگا جیسے خوف کے مارے دم نکل جائے گا۔

''میں نے کہا: میں سنیما دیکھنے گیا تھا۔ وکٹر ہیوگو کی لائزیبل لگی ہوئی ہے۔ یہ پکچر آپ کو ضرور دیکھنا چاہیے۔''

''ہوں، ہوں''

''کیا آپ کھانا کھا چکے ہیں؟ مجھے قطعی بھوک نہیں ہے۔ راستے میں ہم لوگ ماڈرن ہوٹل چلے گئے تھے۔''

''بہت بہت شکریہ، میں کھانا کھا چکا ہوں۔''

''اوہ! تو آپ آرام کیجیے۔''

''گڈ نائٹ۔''

''اچھا! گڈ نائٹ۔''

(ویکوم محمد بشیر)

(مترجم: ضیاالرحمٰن صدیقی)

مشق

سوالات

1. اس افسانے کا عنوان ’’جنم دن‘‘ کیوں رکھا گیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
2. ’’جنم دن‘‘ افسانے کا خلاصہ بیان کیجیے۔
3. افسانہ نگار کے جنم دن کے واقعات میں کس واقعے نے آپ کو بے حد متاثر کیا اور کیوں؟
4. افسانے کے مرکزی کردار کی معاشی تنگدستی کا حال اپنے لفظوں میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished